اشتراکیت اور اسلام

(۳)

از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے

کارل مارکس کا پیش کردہ نظریہ تو اس بارے میں بالکل واضح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشی نظام درجہ بدرجہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے۔ کوئی معاشی نظام اس وقت تک سابقہ نظام کی جگہ نہیں لے سکتا جب تک کہ وہ حالات و شرائط موجود نہ ہوں جو اس کے وجود کے لیے ضروری ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس دور میں جبکہ انسان نظام غلامی کی منزل سے گزر رہا تھا عربوں کی سوسائٹی میں یکایک اشتراکیت سے ایک ملتے جلتے نظام کے لیے ماحول تیار ہو گیا۔ اشتراکیوں کے سامنے جب اس نوع کے سوالات و شبہات پیش کیے جاتے ہیں تو وہ عجیب و غریب تاویلات سے کام لینے لگتے ہیں۔

تاریخی واقعات کی توجیہ کا یہ طریقہ جس کی رو سے معاشی اسباب و محرکات کو انسانی سوسائٹی کی تشکیل میں عنصر غالب شمار کیا جاتا ہے اشتراکی فلسفہ اور تحریک کا لازمی خاصہ بن گیا ہے۔ لیکن گہری نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ تاریخی واقعات و حوادث مختلف النوع اسباب سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مذہبی، سیاسی اور معاشی محرکات مل جل کر واقعات کی تشکیل کرتے ہیں۔ لیکن ان محرکات کی اضافی قوت کا پتہ چلانا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ انسانی فطرت اتنی پیچیدہ ہے کہ انسان کے اجتماعی ارادوں اور اعمال کے متعلق یہ رائے قائم کرنا مشکل ہے کہ ان میں مذہبی محرکات کا حصہ کتنا ہے، سیاسی آرزوئیں اور تمنائیں کہاں تک شامل ہیں، اور معاشی مفاد کا تخیل کس حد تک دخیل ہے۔ ابھی تک وہ آلہ فطرت پیما ایجاد نہیں ہوا ہے جس سے انسانی اعمال کے ان مختلف محرکات و عوامل کا صحیح تناسب معلوم کیا جا سکے۔ اور جب تک اس قسم کا کوئی آلہ اور کوئی تدبیر

انسانی ذہن ایجاد نہ کرے اشتراکیوں کے سوا اور کوئی ہوشمند جماعت یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ مختلف محرکات میں سے کوئی خاص محرک ہمیشہ دوسروں پر غالب رہتا ہے۔

چونکہ اشتراکیت انسانی فطرت کی اس پیچیدگی کو نظر انداز کر کے صرف معاشی محرکات کو انسان کے اجتماعی افعال کا ذمہ دار قرار دیتی ہے اور غیر معاشی محرکات کو ان کے مقابلہ میں بہت کم وزن دیتی ہے اس لیے نتیجہ کے طور پر سوسائٹی کے امراض کے لیے جو علاج وہ تجویز کرتی ہے وہ بھی صرف معاشی اصلاح تک محدود ہے۔ اشتراکیوں کا کہنا یہ ہے کہ ذاتی ملکیت کا وجود ہی دنیا کی تمام برائیوں کا سبب ہے۔ اور اس کے مٹا دینے سے انسان کی تمام معاشرتی خرابیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اشتراکی تحریک اس نظریہ پر مبنی ہے کہ جب سوسائٹی سے طبقاتی امتیازات فنا ہو جائیں گے اور ہر فرد کو اس کی ضروریات زندگی میسر آنے لگیں گی تو سوسائٹی کے اخلاقی عیوب، سیاسی مفاسد اور معاشرتی خرابیاں بہت جلد دور ہو جائیں گی۔ حالانکہ اگر انسان کے اعمال مختلف النوع محرکات سے وجود پذیر ہوتے ہیں اور انسانی فطرت ایک سے زائد عناصر سے ترکیب پاتی ہے تو پھر انسانی مسائل کے حل اور تمدنی خرابیوں کی اصلاح کو صرف ایک جہت سے شروع کرنا کہاں تک نتیجہ خیز ہو سکتا ہے؟

اگر انسانیت کی کامل اصلاح پیش نظر ہے تو یہ اصلاح ہر جہتی ہونی چاہیے۔ تمدن و معاشرت، اخلاق و مذہب، سیاست اور معیشت غرض کہ زندگی کے ہر دائرہ میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ یہ تخیل کہ انسان کی معاشی حالت درست ہو جائے اور ذاتی ملکیت مٹا دی جائے تو وہ یکسر فرشتہ خصلت بن جائے گا، دل کش اور نظر فریب تو ضرور ہے مگر حقیقت سے بہت دور ہے۔ آلڈس ہکسلے (Alduous Hexley) اپنی کتاب "Ends and Means" میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"سیاسی اور معاشی اصلاح دفاعی اخلاقیات کا ایک شعبہ ہے۔ دفاعی اخلاقیات کا مقصد یہ ہے کہ ایسا خارجی ماحول پیدا کیا جائے جس میں انسان کو برائی کرنے کا موقع ہی نہ ہو۔ عیسائی اکثر

یہ دعا کیا کرتے ہیں کہ خدا انھیں برے کاموں کی ترغیب سے محفوظ رکھے۔ سیاسی اور معاشی اصلاح اس دعا کا جواب ہے۔ کیونکہ ایسی اصلاح اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اگر انسان کا معاشرتی ماحول درست کر دیا جائے تو وہ ترغیبات و تحریصات ہی نہ پیدا ہوں گی جن کی وجہ سے انسان برائی پیدا کرتا ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کی اصلاحی کوشش انسان کو ایک برائی سے ہٹا کر دوسری برائیوں میں مبتلا کر سکتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سیاسی اور معاشرتی اصلاح کے نتیجہ کے طور پر انسان کے برے میلانات ایک راہ سے ہٹ کر کسی دوسرے مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں برائی کی ایک راہ بند ہو جاتی ہے مگر دوسری راہیں کھل جاتی ہیں۔ برائی مٹتی نہیں ہے۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ وہ اپنی پہلی شکل میں ظاہر ہونے کے بجائے کسی دوسرے روپ میں نمودار ہوتی ہے۔ مثلاً اس برائی کو لیجیے کہ انسان دوسروں پر غلبہ اور اقتدار کی ہوس رکھتا ہے اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی چاہتا ہے۔ اب اگر گذشتہ زمانہ کا مقابلہ اس زمانہ سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پہلے انسان کی ہوس اقتدار اور غلبہ حاصل کرنے کی خواہش فوجی قوت کے ذریعہ سے پوری ہوتی تھی اور اب وہ مال و دولت کے ذریعہ سے پوری ہوتی ہے۔ کسی زمانہ میں تلوار اور نسلی شرافت اس غلبہ کی علامتیں تھیں، اب روپیہ پیسہ اور مال و دولت نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ روس میں ذاتی ملکیت مٹا دی گئی ہے اور مال و دولت کی بنا پر کسی شخص کے لیے غلبہ و اقتدار حاصل کرنا ناممکن ہے۔ لیکن غلبہ کی خواہش اور اقتدار کی ہوس وہاں بھی اسی طرح موجود ہے۔ صرف وہ شکل بدل گئی ہے جس میں یہ حرص و ہوس نمودار ہوتی تھی۔ روس کے نئے نظام میں سیاسی اور حکومتی اقتدار کا حصول انسان کا مطمح نظر بن گیا ہے۔ وہاں لوگ دولت اور روپیہ حاصل کرنے کے بجائے اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اس منتخب گروہ میں وہ کوئی مقام حاصل کریں جس کے ہاتھ میں ملک کا معاشی اور سیاسی اقتدار ہے۔"

جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ثابت ہوتا ہے محض خارجی اصلاح سے انسانی فطرت کو نہیں بدلا جا سکتا۔ اگر برائی کی فطرت موجود ہے تو وہ اپنے لیے اظہار کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور تلاش کرے گی۔ اسی لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اشتراکیوں کا یہ خیال بالکل لغو اور مہمل ہے کہ معاشی اور سیاسی انقلاب کے ذریعہ وہ ایک ایسی سوسائٹی بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس میں طبقہ واریت بالکل ناپید ہوگی۔ کیونکہ طبقاتی امتیازات کا اصلی سبب پھر بھی باقی رہے گا۔ یہ امتیازات انسان کی اس فطری خواہش سے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ اپنی سوسائٹی اور اپنے ہم چشموں میں کوئی نمایاں مقام حاصل کرے۔

ہر زمانہ میں تفوق و امتیاز کا کوئی معیار ضرور ہوا کرتا ہے اور سوسائٹی کے وہ افراد جو اتفاقات، خوش قسمتی، یا ذاتی جدوجہد سے اس معیار تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ایک خاص طبقہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جاگیرداری نظام میں معیار تفوق خاندانی شرافت اور فوجی مہارت تھی۔ اس لیے جو لوگ فوجی خصوصیات کے حامل تھے اور اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے جاگیردار طبقہ کی صورت اختیار کر لی۔ نظام سرمایہ داری میں دولت کو معیار تفوق تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو لوگ دولت حاصل کر کے اس معیار تفوق تک پہنچ جاتے ہیں وہ مجموعی طور پر سرمایہ دار طبقہ سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ اب فرض کر لیجیے کہ اشتراکی جماعت اپنے خیال کے مطابق واقعی ایک ایسی سوسائٹی کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جائے جس میں ہر شخص کو بقدر ضرورت سامان معیشت حاصل ہو اور دولت کی بنا پر کسی شخص کو کوئی امتیاز نہ حاصل ہو تب بھی اس سوسائٹی میں کوئی معیار تفوق ضرور ہوگا۔ تمام انسان ہر طرح سے برابر ہونے سے رہے۔ امتیاز و برتری کا کوئی نہ کوئی اصول تو بہر حال قائم رہے گا۔ ملک کی خدمت، فنی کارکردگی، یا اور کسی اہلیت کی بنا پر انسان تعریف و توصیف اور عزت و امتیاز کا مستحق ضرور قرار پائے گا۔ پھر کیا یہ یقینی نہیں ہے کہ وہ تمام لوگ جو ان صفات کے حامل ہوں اور سوسائٹی کے مروجہ معیار تفوق پر پورے اترتے ہوں رفتہ رفتہ ایک طبقہ بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان میں امتیاز و فوقیت حاصل کرنے کی خواہش موجود رہے

طبقہ واریت کو بالکل مٹایا نہیں جا سکتا۔

اشتراکی نظام میں طبقہ واریت کا پیدا ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح صبح کے وقت آفتاب کا طلوع ہونا۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ کہ اب تک جتنے تمدن گزرے ہیں وہ سب طبقہ واریت پر مبنی تھے لیکن اشتراکی تہذیب طبقہ واریت کو بالکل مٹا دے گی، جہالت اور ہٹ دھرمی کے سوا اور کسی چیز پر مبنی نہیں ہے۔ خود روس کا موجودہ اشتراکی نظام طبقہ واریت سے خالی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مٹ جانے سے سوسائٹی میں ظالم و مظلوم کی وہ پہلی سی تفریق نہیں رہی ہے جو آفرینش دولت کے آلات و وسائل کی ذاتی ملکیت پر قائم تھی۔ لیکن اشتراکی روس میں اب نئے معاشرتی طبقات وجود میں آنے شروع ہو گئے ہیں جن سے اس مفروضہ کی تردید ہوتی ہے کہ روسی معاشرہ طبقہ واریت سے بالکل پاک ہے۔

یہ نئے طبقے انتظامی عہدہ داروں، ہنر آموختہ (Skilled) مزدوروں اور اجتماعی بنیاد پر کام کرنے والے خوش حال کسانوں پر مشتمل ہیں۔ ان نئے طبقوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے اور موجودہ اشتراکی نظام پر انہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ یہی وہ حکمراں طبقات ہیں جو اس وقت روس کا نظام چلا رہے ہیں۔ ان کی تنخواہیں اور اجرتیں عام مزدوروں اور کام کرنے والوں سے بدرجہا زیادہ ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تقسیم دولت اور معیار زندگی کے اعتبار سے روسی آبادی میں رفتہ رفتہ نمایاں امتیازات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔

انسان کی علمی اور تمدنی ترقی نے اس کے جذبات و تخیلات اور اس کی بنیادی فطرت کو کتنا کم متاثر کیا ہے اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جب کبھی اشتراکیت نے سر اٹھایا ہے اس نے ملک کی قدرتی دولت کی طرح عورتوں کو بھی مشترک ملکیت قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ ایران میں قباد کے زمانہ میں مزدکی مذہب بھی اسی اصول کا حامی تھا کہ مرد و زن کے تعلقات کو شادی بیاہ کے قیود

سے آزاد کر دیا جائے اور مال و دولت کی طرح عورتیں بھی جمہور کی مشترکہ ملکیت ہوں۔ اس سے قبل افلاطون نے اپنی خیالی ریاست کے لیے جو نظام تجویز کیا تھا اس میں سپاہیوں اور محافظوں کے لیے نکاح کی قید اٹھا دی تھی اور محافظوں کو یہ حق دیا تھا کہ وہ جس عورت اور مرد کو چاہیں مناسب اوقات میں یکجا کر دیں۔ یہ یاد رہے کہ افلاطون کی مجوزہ ریاست میں سپاہیوں اور محافظوں کو ذاتی ملکیت سے محروم کر دیا گیا تھا اور ان کے لیے جو نظامِ زندگی بنایا گیا تھا وہ خالص اشتراکی نظام تھا۔ موجودہ روسی اشتراکیت بھی خاندانی نظام کی دشمن ہے اور مرد و زن کے تعلقات پر کوئی قانونی یا اخلاقی پابندی عائد کرنا نہیں چاہتی۔ غرضکہ اباحتِ مطلقہ ہمیشہ سے اشتراکیت کی شان رہی ہے۔

اب ہر انصاف پسند شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایک ایسے نظام میں جہاں ہر شخص کو وسائلِ معیشت بآسانی میسر آتے ہوں اور جہاں صنفی خواہشات و تعلقات پر کوئی اخلاقی، مذہبی یا سماجی گرفت نہ ہو، وہاں صنفی بدعنوانیوں اور فواحش کی کیسی کثرت ہو گی اور انسانی نسل کو کیسا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہوگا۔ اشتراکیوں سے جب کبھی اس موضوع پر بحث کی جاتی ہے وہ فوراً موجودہ اشتراکی روس کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ روس میں صنفی بدعنوانیوں کی وہ کثرت نہیں ہے جو امریکہ یا انگلستان یا فرانس میں ہے۔ حالانکہ وہاں مرد و زن کے تعلقات پر کوئی قید نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ اشتراکیوں کا کہنا صحیح ہو اور روس میں ابھی تک وہ حالت نہ پیدا ہوئی ہو جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن روس کی موجودہ حالت کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے اشتراکیوں کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ اول تو روس میں ابھی اشتراکی نظام پوری طرح قائم ہی نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ جیسا اس سے قبل بتایا جا چکا ہے خود لینن نے اکثر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ روس کے موجودہ نظام کو اشتراکی نظام نہیں کہا جا سکتا بلکہ ریاستی سرمایہ داری (State Capitalism) کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ دوئم یہ کہ اخلاقی محاسن کی طرح اخلاقی معائب کے نتائج و اثرات بھی بہت دیر میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ابھی روسی نظام قائم ہوئے صرف بیس یا بائیس سال کا عرصہ گزرا ہے اور اشتراکی تربیت پائے ہوئے نوجوانوں کی پہلی نسل بھی تیار نہیں ہوئی ہے۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ابھی روسی اشتراکیت تخیل اور نصب العین کی زندگی سے مالا مال ہے اور دوسرے سرمایہ دار ممالک سے اس کا مقابلہ ہے۔

اگر اشتراکیوں کے تخیل کے مطابق ساری دنیا پر اشتراکی نظام غالب آ جائے یا اشتراکیت دنیا کے بڑے حصہ میں پھیل جائے اور تخیل کی وہ تازگی اور نصب العین کی وہ قوت مرور زمانہ سے پژمردہ ہو جائے جو ابھی تک اس میں باقی ہے تو اس وقت مادی خوش حالی اور لذت پرستی کے سوا اور کوئی نصب العین اس سوسائٹی میں نہ ہوگا اور نہ طاقتور حریفوں کا خوف اسے اپنی اندرونی اخلاقی حفاظت پر آمادہ کریگا۔ اس وقت جو اخلاقی انتشار اشتراکی سوسائٹی میں پیدا ہوگا اس کی وجہ سے اشتراکی نسل قطعاً برباد ہو جائے گی۔

اسلامی نظریات

جو لوگ اشتراکیت اور اسلام کے امتزاج سے ایک نیا مرکب تیار کرنا چاہتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے وہ انتہائی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اشتراکیت ماورائے مادہ کسی حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے حالانکہ اسلام سب سے پہلا مطالبہ انسان سے یہ کرتا ہے کہ وہ چند بنیادی حقائق پر ایمان لے آئے جو تجربہ کی رسائی سے ماوراء اور عقل کے حدود سے بالاتر ہیں۔ اسلام کی ساری تعلیم خدا کے تصور اور آخرت کے یقین پر قائم ہے اور کوئی شخص اسلامی سوسائٹی کا رکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی ذات و صفات اور حیاتِ اخروی کے دونوں بنیادی حقائق کو بے چون و چرا تسلیم نہ کر لے۔ اس کے برخلاف کوئی شخص کمیونسٹ پارٹی میں شرکت نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خدا کے وجود اور آخرت کے تصور کا منکر نہ ہو۔

اس بنیادی فرق کو سمجھ لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاشی امور کے متعلق اسلام اور اشتراکیت کے نقطہ نظر میں کیا فرق ہے۔ غور سے دیکھیے تو معاشیات کے دائرے میں بھی یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اشتراکیت معاشی خوش حالی کے حصول کو مقصود بالذات قرار دیتی ہے۔ اس کا ابتدا و منتہا

اور مقصد و غایت ہی مادی فراغت اور معاشی مساوات ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حصولِ معیشت اور اکتسابِ مال بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسیلہ ہے اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کا۔

اسلام نے چونکہ انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کا نائب قرار دیا ہے اور اس حیثیت میں اس کے سپرد یہ منصب کیا ہے کہ وہ انفرادی طور پر خدا کی ذات و صفات سے قربت و مشابہت حاصل کرے اور اجتماعی حیثیت سے خدا کے قانون کو انسان کے خود ساختہ نظریات و قوانین پر بالاتر کرے اس لیے وہ معاشی اصلاح کو اس نصب العین کے حصول کا ایک ضروری وسیلہ قرار دیتا ہے اور انسان کے معاشی مسئلہ کو اسی حیثیت پر قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کو نہ کسی خاص طبقہ سے کوئی دشمنی ہے نہ وہ غریبوں کو دولتمندوں سے رشک و حسد کرنا سکھاتا ہے اور نہ اسے بورژوا یا متوسط طبقہ سے نفرت ہے۔ وہ معاشی اصلاح کے ذریعہ دولت کو محدود ہو جانے سے روکنا ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن اس کا اصل مقصد انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا بیدار اور قوی کر دینا ہے کہ ہر فرد اخوت و ہمدردی کے جذبہ سے سرشار ہو جائے اور دوسروں کے مصائب و تکالیف میں ان کی مالی اعانت کرنا اپنا دینی فرض خیال کرے۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے جس میں دولت سمٹ سمٹا کر ایک محدود طبقہ کے ہاتھوں میں نہ چلی جائے بلکہ وہ سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ افراد کے درمیان پھیلے اور گردش کرے۔ اس کے متعلق کلام مجید کا ارشاد یہ ہے:-

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ

جو کچھ اللہ اپنے رسول کے ہاتھ لگا دے بستیوں والوں سے وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (رسول کے) ناتے والوں کے لیے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ صرف دولتمندوں کے درمیان گردش نہ کرے۔

آیت کے آخری جزو میں اس نے صاف طور پر کہدیا ہے کہ وہ اجتماعی دولت کو صرف دولتمندوں کا حق نہیں سمجھتا بلکہ اس کی تقسیم میں ہر طبقہ کے افراد کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کو مٹانے کی پوری کوشش کی ہے جو دولت حاصل کرنے میں تو بڑی بے باک ہے لیکن اس کے صرف کرنے میں بیحد تنگ دل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم دولت کما سکتے ہو لیکن یہ حق نہیں رکھتے کہ اس کے انبار لگاتے رہو یا صرف اپنی راحت و آرام پر اسے صرف کرتے رہو۔ نماز اور زکوٰۃ کے بعد کلام مجید میں شاید ہی کسی اور بات کو اتنی بار دہرایا گیا ہو جتنا اس بات کو کہ دولت خدا کی راہ میں صرف کرتے رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو سختی سے متنبہ کیا گیا ہے جو دولت جمع کرتے ہیں لیکن خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے۔ ارشاد ہوا ہے:-

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں لیکن خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں سخت عذاب کی خوشخبری دیدو۔

ایک اور جگہ یہ بات بتائی گئی ہے کہ انسان نیکی حاصل نہیں کرسکتا جب تک اپنی دولت کو راہ خدا میں صرف نہ کرے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	تم نیکی ہرگز حاصل نہ کرسکو گے جب تک کہ ہر اس چیز کو جس سے تم محبت کرتے ہو (راہ خدا میں) صرف نہ کرو

دولت کو زیادہ سے زیادہ افراد میں تقسیم کرنے کی غرض سے اسلام نے خاندانی نظام کو باقی رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ خاندان انسانی زندگی اور تمدن کی ایک قدرتی اکائی ہے اور دنیا کے تمام خارجی نظامات میں سب سے زیادہ مستحکم اور بھروسہ کے قابل ہے۔ حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ سیاسی اور معاشی انقلابات کی آندھیاں آتی اور گزر جاتی ہیں۔ طبقاتی تقسیم بدلتی رہتی ہے۔ لیکن خاندان اپنی جگہ

مضبوطی سے قائم ہے اور رہے گا۔ اشتراکیوں اور دوسرے خیال پرستوں کے ادعا کے باوجود انسانی تمدن پر وہ دور کبھی نہیں آیا اور نہ آسکتا ہے جب انسان خاندانی رشتوں اور بندھنوں سے اپنا پیچھا چھڑا سکے۔ جہاں بھی دس بیس آدمی بسیں گے شادی بیاہ ہوگا، شوہر، بیوی، ماں باپ، بھائی، بہن، داماد، خسر کے رشتے ہوں گے اور انسان العقول اور قرابتوں کے ایک پھیلتے ہوئے سلسلہ میں منسلک رہے گا۔

انسانی زندگی کی اس فطری وحدت کو اسلام اپنے اخلاقی اور معاشی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس باہمی امداد و معاونت کے جذبے پر جو فطرۃً خاندان کے افراد میں ایک دوسرے کے لیے موجود ہوتا ہے وہ مذہبی احساس کی مہر لگا دیتا ہے تاکہ انسان نفس پرستی اور خود غرضی کی کیسی ہی شدید حالت سے گزر رہا ہو پھر بھی کم از کم ایک محدود دائرہ میں وہ دوسروں کی امداد و پرورش کا ذریعہ بنا رہے اسی غرض سے اسلام نے خاندانی زندگی کو چھوٹے پیمانہ پر امداد باہمی کا ادارہ بنا دیا ہے اور اہل خاندان کے حقوق و فرائض پر مذہبی احکام کا وزن ڈال دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں کئی مقامات پر ذوی القربیٰ کے حقوق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور غیر مستطیع اقربا کی امداد انسان کی پہلی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ ایک جگہ نہایت بلیغ انداز میں یہ حکم سنایا گیا ہے :-

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۔	اللہ تمھیں حکم دیتا ہے انصاف کا، نیکی کا، اور (غیر مستطیع) عزیزوں کی امداد کا اور تمھیں روکتا ہے فحش باتوں اور برے کاموں اور نافرمانی سے۔

اپنے قوانین وراثت میں بھی اسلام نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ وراثت افراد خاندان کی زیادہ سے زیادہ تعداد پر تقسیم ہو۔ اس بارے میں اگر ان کا مقابلہ مغربی ممالک کے مماثل قوانین سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں میں دولت اس طرح ایک جگہ جمع ہی نہیں ہوسکتی جیسے کہ مغرب میں وہ ایک

خاص حلقہ میں گردش کرتی رہتی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کا سنگ بنیاد زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ وہ رقم ہے جو صاحب استطاعت افراد سے لے کر غریبوں اور غیر مستطیع افراد میں تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ زکوٰۃ اس قسم کی کوئی رقم ہے جو آج کل حکومتیں اپنی رعایا سے وصول کرتی ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے جتنے ٹیکس عوام سے وصول کیے جاتے ہیں وہ ان منافع اور فوائد کے معاوضہ میں لیے جاتے ہیں جو عوام کو حکومت کی سرگرمیوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن زکوٰۃ وہ ٹیکس ہے جو محض غیر مستطیع افراد کی مالی اعانت کے لیے وصول کیا جاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں محصول دہندگان (Tax-payers) کو کوئی دوسرا فائدہ کسی اور شکل میں نہیں ہوتا ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ کے مصارف بھی معین کر دیے گئے ہیں۔ یعنی زکوٰۃ کی رقم صرف غریبوں کی مالی اعانت میں صرف کی جاسکتی ہے۔ لیکن دوسرے مصرف میں نہیں لگائی جاسکتی۔

یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ غربار اور حاجتمندوں کی تعداد کے مقابلہ میں زکوٰۃ کی رقم اس قدر قلیل ہوگی کہ اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ حکومت جو معاشرتی خدمات Social Services انجام دیتی ہے، مثلاً سڑکوں اور پلوں کی تیاری، آب پاشی اور نہر سازی کے انتظامات، ریلوں اور ہوائی سروس کا قیام یا اسی طرح کے دوسرے کام، ان کے لیے زکوٰۃ کی رقم میں سے ایک پیسہ بھی وہ صرف کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ جب اس بات کا لحاظ کیا جائے کہ اسلامی حکومت میں معادن (Mines) پر بھی خمس یعنی پانچواں حصہ وصول کیا جاتا تھا اور اس کا شمار بھی زکوٰۃ میں ہوتا تھا تو پھر یہ اعتراض اور بھی بے معنی ہو جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم لاکھوں بلکہ کروڑوں تک پہنچ سکتی ہے۔

ایک اور بے معنی اعتراض اس سلسلہ میں یہ کیا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کو غیر مستطیع افراد پر صرف کرنے سے یہ لوگ ناکارہ ہو جائیں گے اور ان میں کام کرنے کا حوصلہ باقی نہیں رہے گا۔ معترضین شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت ہر غریب آدمی کو گھر بیٹھے زکوٰۃ کی رقم میں سے اس کا حصہ دیا کرے گی خواہ وہ کوئی کام کرے یا

نہ کرے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کوئی ہوشمند حکومت افرادِ ملک کو اس طرح بے کار رہنے کی تعلیم نہیں دے گی۔ مستحقین تک زکوٰۃ کی رقم پہنچانے کے ہزاروں طریقے ہو سکتے ہیں جن سے ان کی احتیاج بھی دور ہو جائے اور بے کار بیٹھ کر کھانے کی عادت بھی نہ پڑے۔ مثلاً غریبوں کے لیے حکومت سستے اور آرام دہ مکانات تعمیر کر سکتی ہے، غریب بچوں کے لیے وسطانی اور تحتانی تعلیم مفت کر دی جا سکتی ہے، غریب طلباء کے لئے خریداری کتب کا انتظام کیا جا سکتا ہے، غریب کسانوں کے قرضہ کا بار ہلکا کیا جا سکتا ہے، یا انہیں اشیاء اور آلات خریدنے کے لیے رقم دی جا سکتی ہے، بیواؤں کے لیے وظائف مقرر کیے جا سکتے ہیں، غرضکہ متعدد صورتوں میں زکوٰۃ اس طرح صرف کی جا سکتی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے والے بے کار نہ بن جائیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کے تمام قدرتی وسائل اور اس کی قدرتی دولت افراد کی نہیں بلکہ حکومت کی ملک ہے۔ آئندہ اگر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو وہ تمام بنیادی اور کلیدی صنعتیں جن پر صنعتی نظام کا دار و مدار ہوتا ہے حکومت کی ملک ہوں گی۔ ایسی حکومت میں سرمایہ داروں کا زور بالکل ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ جو صنعتیں انفرادی طور پر اہلِ ملک کے قبضہ میں رہیں گی وہ بنیادی صنعتوں کی پیداوار سے استفادہ کیے بغیر قائم نہ ہو سکیں گی۔ اس دعوے کے لیے سب سے مضبوط سند حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ ہے جو آپ نے شام و عراق کی فتوحات کے بعد وہاں کی اراضی کی ملکیت کے بارے میں فرمایا تھا۔ ان ممالک کی مفتوحہ اراضی کے متعلق اہلِ فوج کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ ان سپاہیوں اور فوجوں کو دیدی جائیں جنھوں نے ممالک مذکور فتح کیے تھے۔ اس مطالبہ کی سند میں اہلِ فوج نے رومی سلطنت کے جاگیری نظام کو پیش کیا جس کے تحت شام کی اراضی اس کے اصلی باشندوں سے چھین کر زمینداروں اور فوجی جاگیرداروں میں تقسیم کر دی گئیں اور زمینوں کے اصلی مالکوں کو مزدوروں کی طرح اجرت پر کام کرنا پڑتا تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلِ فوج کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا اور ان کے

لیے ماہوار تنخواہیں اور وظائف مقرر کرکے مفتوحہ اراضی کو حکومت کی ملکیت قرار دیا اور زمینیں ملک کے اصلی باشندوں کو واپس کر دیں۔ اور اس طرح جاگیرداری نظام کو یکقلم مٹا دیا۔

اسلام کے معاشی نظام کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام نہ تو خالص اشتراکیت ہے اور نہ خالص سرمایہ داری بلکہ ان انتہاؤں کے درمیان وہ ایک اعتدال پیدا کرتا ہے۔ وہ ذاتی ملکیت کو باقی رکھنا ضروری خیال کرتا ہے لیکن اس پر ایسی قیود و شرائط عائد کرتا ہے کہ وہ معاشی استحصال (Exploitation) کا ذریعہ نہ بننے پائے۔

معاشیات میں اسلام اور اشتراکیت کے درمیان جو کچھ مشابہت نظر آتی ہے وہ صرف سطح سے تعلق رکھتی ہے ورنہ اپنی بنیاد اور روح کے اعتبار سے ان دونوں نظامات میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔

اخلاق و معاشرت اور تمدن کے مسائل میں اشتراکیت اور اسلام کے نقطہ نظر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اخلاقی اصلاح کی بابت اشتراکیت کا نقطہ نظر خارجیت پسندی پر مبنی ہے یعنی وہ انسان کی اخلاقی برائیوں کو خارجی ماحول کی خرابیوں پر محمول کرتی ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اگر انسان کا عمرانی ماحول درست کر دیا جائے، اسے معاشی آزادی دے دی جائے، اور سیاسی غلامی کی زنجیروں سے اسے رہا کر دیا جائے تو اس کی تمام برائیاں اور مجرمانہ میلانات خود بخود دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ جرم اور بداعمالی کی ترغیب معاشرتی مجبوریوں سے ہوتی ہے۔

اشتراکیت انسانی فطرت کی طرف سے بہت خوش عقیدہ واقع ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام نے نہ تو سینٹ پال کی عیسائیت کی طرح انسان کو پیدائشی گنہگار قرار دیتے ہوئے اس کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اس کی سرشت سے برائی دور ہی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اشتراکیت کی طرح انسان کے متعلق یہ حسن ظن رکھتا ہے کہ خارجی اور عمرانی ماحول کے درست ہوتے ہی انسان فرشتہ بن جائے گا۔ اس بارے میں بھی وہ اپنے اس اعتدال اور توازن کو نہیں چھوڑتا جو اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے

سو ایک حد تک انسان کا معاشرتی ماحول اسے برائی کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ جہاں عمرانی اور معاشرتی ماحول کی اصلاح سے انسان کی بہت سی برائیاں دور ہو سکتی ہیں وہاں بعض برائیاں ایسی بھی ہیں جن کا عمرانی اور معاشرتی ماحول سے کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔ اور جو ضبطِ نفس کی کمی، اخلاقی تربیت کے فقدان اور ماورائے مادہ حقائق پر ایمان نہ لانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر خارجی ماحول کو درست کر دیجیے اور یقیناً اسے درست کرنا چاہیے تو بعض برائیاں دور ہو جائیں گی لیکن بہت سی برائیاں پھر بھی باقی رہیں گی اور یہ برائیاں اس وقت تک نہیں مٹ سکتیں جب تک انسان میں وہ اخلاقی احساس نہ پیدا ہو جائے جو حکومت کے جبر و تخویف، سوسائٹی کی مدح و ذم اور دنیوی نتائج کے خوف سے بے نیاز ہو کر بھی اسے نیکی اور سچائی پر قائم رکھے۔

جو انسان برائی سے اس لیے بچا رہے کہ اس کا ماحول ایسی ترغیبات سے خالی ہے جو اسے برائی کی طرف مائل کریں وہ یقیناً بہت کمزور بنیاد پر کھڑا ہے۔ کیونکہ ماحول کی ذرا سی خرابی اسے بھی بُرا بنا سکتی ہے۔ سیرت کی مضبوطی اور کردار کی بلندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان برائی کے درمیان رہ کر بھی اپنی اخلاقی قوت کے باعث اس سے محفوظ رہے۔ یہ سیرت اور یہ کردار اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب انسان اپنی مادی زندگی کے علاوہ ایک حیاتِ برتر کا یقین رکھتا ہو جس میں بدی کا نتیجہ نقصان و تکلیف کی شکل میں اسی قطعیت و تیقن کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جیسے اس عالم میں طبعی اسباب کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسلام نے خدا کے تصور اور آخرت کے یقین کو اپنے اخلاقی نظام کا سنگِ بنیاد قرار دیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے خارجی زندگی کی اصلاح کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔

درحقیقت وہ زندگی اور تمدن کے مسائل پر ہر طرف سے حملہ آور ہوتا ہے تاکہ ان کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہ رہے۔ وہ تسخیرِ کامل کا عزم لے کر اٹھا ہے۔ بخلاف اس کے دوسرے نظامات صرف جزوی تسخیر پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنا حملہ صرف ایک نقطہ پر مرکوز کر کے سارا کھیل بگاڑ دیتے ہیں، کیونکہ اس

غلط چال کی وجہ سے خود حملہ آور بعض وقت محصور ہو جاتا ہے۔

آخر میں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اشتراکیت کوئی عالمگیر تحریک نہیں ہے بلکہ وہ مغربی دنیا کے حالات اور مغرب کے نفسیاتی اور اخلاقی مزاج کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ اس کے اصول اسی نفسیاتی اور اخلاقی ماحول کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ مشرق اور خصوصاً اسلامی ممالک اپنا ایک الگ ماحول رکھتے ہیں اور ان کی تاریخ جن اخلاقی اور نفسیاتی موثرات سے بنی ہے وہ ان عوامل سے مختلف ہیں جنھوں نے مغرب کی تاریخ بنائی ہے۔ درحقیقت اشتراکی تحریک مغرب کے زوال آمادہ اور سڑے ہوئے تمدن کا آخری [illegible] وار ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ وار بھی خالی جائے گا۔ ہماری لڑائی اس سے اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر کوئی صداقت نہیں رکھتی۔ وہ ایک بہت بڑی صداقت کی حامل ہے۔ لیکن اس صداقت پر باطل اوہامات و تخیلات کے تہ در تہ پردے ڈال کر اصلیت کا چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ اسلامی نظام سے اس کا مقابلہ کرنا بے کار ہے کیونکہ یہ نظام ایک فطرت حنیفیہ ہے۔ اور مخالفوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو دنیا کو مجبوراً گھوم پھر کر پھر اسی طرف آنا ہے۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔

(کفار) چاہتے ہیں کہ اپنی پھونک سے خدا کا نور بجھا دیں لیکن اللہ اپنا نور پورا کر کے رہے گا خواہ منکروں پر یہ بات کتنی ہی گراں گزرے۔